R N 2186/57 — Regd. No. A 823

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Telephone No. 39

Telegrams "ANJUMAN"

جلد ۲۱ - شمارہ ۲۳ | ایڈیٹر - آل احمد سرور | علی گڑھ - ۱۵ر جون ۱۹۶۲ء

سلطانہ شرف

مسدس بے نظیر کا سنہ تصنیف

"مسدس بے نظیر" مشہور ریختی گو جان صاحب لکھنوی کی تصنیف ہے۔ یہ تصنیف ۱۸۶۶ء سے ۱۹۳۱ء تک غیر مطبوعہ حالت میں رضا لائبریری رام پور میں محفوظ رہی۔ ۱۹۵۵ء میں رام پور کے مشہور محقق محمد علی خاں اثر رام پوری نے اپنے طویل مقدمہ کے ساتھ اس کو شائع فرمادیا۔ اثر صاحب کے اس کام کو عام ادبی حلقوں نے سراہا تھا۔

"مسدس بے نظیر" جان صاحب نے نواب کلب علی خاں کے حضور میں پیش کرنے کے لئے تصنیف کیا تھا۔

نواب خلد آشیاں ۱۸۶۵ء میں تخت نشین ہوئے تھے انہوں نے جشن تخت نشینی کی یادگار کے لئے ایک سالانہ میلے کی طرح ڈالی۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا میلہ مارچ ۱۸۶۶ء میں ہوا تھا۔ نواب خلد آشیاں کے عہد میں یہ میلہ مسلسل ۲۲ سال ہوتا رہا۔

میلہ بے نظیر کو تاریخی حیثیت یوں تو اس دور کے تمام شاعروں نے دی تھی جو اس وقت دربار رام پور سے وابستہ تھے لیکن اس میلے کی ابتدائی حالت کا عکس صرف ایک شاعر نے پیش کیا اور وہ جان صاحب لکھنوی تھے۔

مجھے اس وقت جان صاحب کی شاعرانہ عظمت یا "مسدس بے نظیر" میں فنی باریکیاں تلاش کرنا نہیں، بلکہ اس وقت مسدس کے سال تصنیف کے بارے میں کچھ گفتگو کرنا ہے۔

اثر صاحب نے اس کے سال تصنیف کے بارے میں مسدس کا بند [illegible] اور ایک مصرعہ پیش کیا ہے۔

مشہور شاعروں میں ہیں منشی سلطان امیر — استاد میں ہیں منشی مظفر علی اسیر

یکتائے جلال اور زمانے کی دولت میں بے نظیر — یہ چاروں آفتاب ہیں چاروں ہیں منیر

سرکار اس رباعی کی تو قدر کرتے ہیں

قطعے، قصیدے اور وہ تحریر کرتے ہیں

اس کے بعد:-

پھر اگلے سال ساد ہی شہر ہے جشن کا

مجھے اثر صاحب کی تحقیق سے انکار نہیں انہوں نے یہ ٹھیک ہی قیاس کیا کہ "اگلے سال" والا مصرعہ ۱۸۶۷ء کی طرف اشارا کر رہا ہے لیکن یہ صرف قیاس ہے۔ یہ مصرعہ تو ہر سال گزر جانے کے بعد ہر دوسرے سال پر چسپاں کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح زکی کے تاریخ انتقال کے بارے میں بھی صرف "انتخاب یادگار" از منشی امیر مینائی مرحوم کی اس تحریر پر قیاس کر لیا ہے۔ "میر زکی" ریاست میں برسوں ملازم رہے۔ پھر حیدر آباد دکن کو گئے اور وہاں کئی برس مقیم رہے۔ پھر وہاں سے رخصت لے کر وطن پہنچے اور وطن ہی میں ۱۲ر شعبان ۱۲۸۵ھ ہجری میں بعمر پچاس سال انتقال ہو گیا۔

اس عبارت سے اثر صاحب نے مسدس کا سال تصنیف ۱۸۶۷ء و ۱۸۶۸ء قیاس کیا ہے۔ اس سلسلے میں میری تحقیق یہ ہے کہ مسدس کا سال تصنیف بغیر کسی شک و شبہ کے ۱۸۶۶ء ہے ۱۸۶۷ء یا اس کے بعد کا کوئی سن نہیں۔ ثبوت ذیل میں پیش کرتا ہوں۔ مسدس کا بند [illegible] ہے:

کارندہ خیر خواہ نہایت نمک حلال — دو ہیں وزیر علی خاں ہیں یہ شان

پھلتے رہیں ہمیشہ رہیں بے کمال — آتا ہیں یہ کہتے ہیں انجام و خیال

مشہور جانتا ہے جہاں ان کو قدیم سے

نواب کا ... ادب سے ... کرتے

وزیر علی خاں کے بارے میں سُن لیجئے۔ میں نے مسدس کے سال تصنیف کے تعین کے لئے ان کا نام کیوں پیش کیا بند مذکورۂ بالا کے پانچویں مصرعہ سے یہ تو ظاہر ہو گیا کہ یہ وزیر علی خاں نواب خلد آشیاں کے خانساماں تھے۔ لیکن میں آپ کی توجہ اس طرف کرانا چاہتا ہوں۔ اس بند میں جان صاحب نے وزیر علی خاں کا ذکر اس طرح کیا ہے جیسے وزیر علی خاں حیات ہیں۔ لیکن جب ہم اخبار الصنادید جلد دوم از نجم الغنی صاحب مرحوم دیکھتے ہیں تو اس کے صفحہ ۱۴۰ پر خانساماں وزیر علی خاں کا انتقال یکم مئی ۱۸۷۶ء لکھا ہوا ملتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر مسدس کا سال تصنیف ۱۸۷۶ء ہوتا تو اس میں وزیر علی خاں کا ذکر اس طرح ہوتا۔ ع

دربار میں وزیر علی خاں تھے بے مثال

یہ بند اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ اس مسدس کا سنہ تصنیف ۱۸۶۷ء ہے۔ دوسرا ثبوت اور حاضر ہے۔ مسدس کا بند ۹ میں جان صاحب نے مرزا خاں داغ کا ذکر اس طرح کیا ہے۔ ـــہ

میری مجال کیا کہ غزل کی لکھوں ثنا　　سرکار نے ہے کام بھی ان کو عطا کیا
دہلی کے شاعروں میں ہیں نواب میرزا　　روشن داغ نور کا پہنا ہے اے ہما
کرتے غزل میں اپنا تخلص وہ داغ ہیں
یہ شاعروں کی بزم میں روشن چراغ ہیں

مرزا داغ کی آمد رامپور یوں تو ۱۸۵۶ء سے رامپور میں ہو گئی تھی لیکن باقاعدہ ملازم ۱۴ر اپریل ۱۸۶۶ء کو ہوئے تھے اس موقع پر کسی ستم ظریف نے اصطبل رامپور کی دیوار پر یہ شعر لکھوا دیا تھا۔ ـــ

دلی سے آیا ایک مشکی　　آتے ہی اصطبل میں داغ ہوا

بند مذکور کا دوسرا مصرعہ دعوتِ تحقیق دے رہا ہے۔ ع

سرکار نے ہے کام بھی ان کو عطا کیا

پہلا میلہ بے نظیر مارچ ۱۸۶۶ء میں لگا تھا۔ داغ پہلے میلے کے وقت ملازم نہیں تھے۔

اس بند کا مصرعہ مذکورہ بھی اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ ۱۸۶۷ء ہی مسدس کا سال تصنیف ہے ان تاریخی شہادتوں کے بعد کوئی وجہ نہیں رہ جاتی کہ ہم جان صاحب کی اس ادبی کاوش کا سنہ تصنیف ۱۸۶۷ء نہ مانیں۔

آلِ احمد سرور

ڈاکٹر اشرف کی یاد میں

۱۰ر جون کے اخبار میں ایک چھوٹی سی خبر چھپی کہ ڈاکٹر اشرف کا مشرقی برلن میں حرکتِ قلب بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا۔ جو لوگ ڈاکٹر اشرف سے واقف تھے، ان کے لئے یہ خبر ایک بہت بڑے سانحے کا اعلان تھی۔ اخبار والے تو ان کو صرف ایک مشہور کمیونسٹ لیڈر کی حیثیت سے جانتے تھے، مگر ہندوستان کے علمی حلقوں میں وہ اور بھی بہت کچھ تھے۔ تاریخ کے ایک ممتاز استاد اور ایک بلند پایہ محقق، اردو کے بہت اچھے ادیب، شعر و ادب کا بڑا پاکیزہ ذوق رکھنے والے، بڑی جاندار نثر لکھنے والے، بڑی شاندار تقریریں کرنے والے، بڑی باغ و بہار شخصیت کے مالک۔ افسوس انہوں نے وطن سے اتنی دور پردیس میں جان دی۔ غالب نے شاید انہیں کے لئے کہا تھا۔ ؎

مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے مری بے کسی کی شرم

ڈاکٹر اشرف کو پہلے پہل میں نے علی گڑھ کی جوبلی میں ۱۹۲۵ء میں دیکھا تھا۔ میں غازی پور کے ایک اسکول میں ساتویں درجے میں پڑھتا تھا۔ جوبلی کا شوق کھینچ کر علی گڑھ لے آیا تھا۔ یونین میں ایک مباحثہ تھا۔ بڑے بڑے علما اور لیڈر جمع تھے۔ مگر ان کی موجودگی کے باوجود نوجوان نائب صدر جس قابلیت اور متانت سے مباحثے کو چلا رہا تھا اس سے سب متاثر تھے۔ یہ نوجوان کنور محمد اشرف تھا۔

اشرف نے اس کے بعد الور میں مہاراجہ کے یہاں ملازمت کر لی پھر کسی طرح انگلستان پہنچ گئے۔ وہاں سے تاریخ میں پی ایچ ڈی کرنے کے بعد واپس آئے۔ میں ۱۹۳۲ء میں انگریزی میں ایم۔ اے کرنے علی گڑھ پہنچا اور یونین میں تقریریں کرنے لگا۔ وہیں ایک دن اشرف سے ملاقات ہوئی۔ اردو کا آل انڈیا مباحثہ تھا۔ اشرف اور رشید احمد صدیقی جج تھے۔ علی گڑھ کی نمائندگی انصار ہروانی نے اور میں نے کی۔ موضوع یہ تھا کہ سرمایہ داری کا نظام، اسلام کی تعلیم کے منافی ہے مجھے مخالفت میں بولنا تھا۔ میں نے صرف سرمایہ داری کی خوبیاں بیان کیں اور ان خوبیوں کو گنانے کے بعد کہا کہ جس نظام کے یہ کمالات ہوں وہ اسلام کی تعلیم کے منافی کیسے ہو سکتا ہے کیونکہ اسلام ہر اچھی چیز کی خوبیوں کو تسلیم کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ میری تقریر ایک طالب علم کی سی تھی مگر چونکہ اس میں طنز خاصا تھا اس لئے اشرف نے اس کی بڑی تعریف کی۔ اس کے کچھ دن بعد میرس روڈ پر ایک مشاعرہ تھا۔ میں پہنچا تو وہاں اشرف بھی موجود تھے۔ رات بھر مشاعرہ ہوتا رہا۔ شاعروں کا کلام ہم نے کم سنا، اشرف کے بہت سے چبھتے ہوئے جملے، برجستہ اشعار زیادہ سنے۔ جب سپیدۂ سحری نمودار ہوا تو سائل دہلوی نے اپنی غزل پڑھی اور پھر ہم لوگ گھر آ گئے۔

دو سال تک اشرف یہ کوشش کرتے رہے کہ انہیں یونیورسٹی میں جگہ مل جائے۔ مگر کسی نے ان کی بات نہ پوچھی۔ بالآخر نواب اسماعیل خاں نے ۱۹۳۳ء میں انہیں سو روپے ماہوار کی جونیئر لیکچرری دے دی۔ سال بھر کے بعد جب ڈاکٹر ضیاء الدین وائس چانسلر ہوئے تو وہ بھی ختم ہو گئی۔ ہمارے تعلیمی نظام کا یہ بھی ایک عجوبہ ہے کہ اشرف کو باوجود لندن سے پی ایچ ڈی کرنے کے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ میں ایک لیکچرر کی جگہ نہ مل سکی۔ لطف یہ ہے کہ یونیورسٹیاں اس بات کا دعویٰ کرتی ہیں کہ وہاں صرف قابلیت دیکھی جاتی ہے سیاسی خیالات سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ میرا دعویٰ یہ ہے کہ اگر اشرف کی علمی صلاحیت سے علی گڑھ میں یا کسی علمی ادارے میں کام لیا جاتا تو نہ ان میں اتنی تلخی پیدا ہوتی، نہ وہ اس قدر انتہا پسند ہوتے۔ علی گڑھ سے صاف جواب ملنے کے بعد اشرف پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ کانگریس کے دفتر میں کام کرنے لگے۔ اسی زمانے میں غالباً جے پرکاش نراین، آچاریہ، لوہیا، ڈاکٹر زیڈ۔ اے احمد اور سجاد ظہیر بھی وہیں تھے۔ اب اشرف نے کانگریس کے پلیٹ فارم سے دھواں دھار تقریریں کرنا شروع کر دیں اور بہت جلد ملک کے ممتاز مقرروں میں ان کا شمار ہونے لگا۔ جب کمیونسٹ کانگریس سے الگ ہوئے تو اشرف بھی الگ ہو گئے اور اس وقت سے ۱۹۴۷ء تک وہ ایک کمیونسٹ لیڈر کی حیثیت سے سیاسی سرگرمیوں میں لگے رہے۔ اس زمانے میں علم و ادب سے ان کا رشتہ ٹوٹا تو نہیں مگر کچھ یونہی سا رہ گیا مگر ان کے پی ایچ ڈی کے مقالے کا علمی حلقوں میں چرچا ہوتا رہا۔ جب ملک آزاد ہوا تو اشرف میوات میں تھے۔ سنا ہے کہ وہاں انہوں نے کسانوں کو منظم کیا۔ اور جب حالات ان کے لئے خطرناک ہونے لگے تو چپکے سے پاکستان پہنچے۔ وہاں بھی خطرہ نظر آیا تو کسی نہ کسی طرح انگلستان چلے گئے۔ انگلستان کے قیام میں اشرف نے زیادہ وقت برٹش میوزیم میں صرف کیا اور ازمنۂ وسطیٰ کے ہندوستان کی تاریخ کے متعلق بہت سا مواد فراہم کر لیا جسے وہ مرتب کرنا چاہتے تھے مگر کر نہ سکے۔ میں نے وہ مواد دیکھا ہے اور اگر اشرف اس کو اسی طرح شائع کر دیتے تب بھی وہ اس میدان میں کام کرنے والوں کے لئے بہت مفید ہوتا۔ اس زمانے میں انہوں نے تاریخِ ہند پر کئی معرکۃ الآرا مضمون لکھے اور سرسید نے جو مواد ایلیٹ اور ڈاوسن کے لئے جمع کیا تھا اس کی نشاندہی کی۔ انہوں نے ثابت کیا کہ برطانوی مورخوں نے کس طرح ہماری تاریخ کے ان حصوں کو نظر انداز کیا ہے جو ہماری تہذیب اور تمدن کے شاندار کارناموں کے مظہر ہیں۔

اشرف کے لئے ہندوستان آنا آسان نہ تھا وہ مجبوراً اور جب حالات کی وجہ سے یہاں سے گئے تھے۔ یہ جانتے ہوئے بھی پنڈت جواہر لال نہرو کی قدر شناسی اور فراخ دلی کی دلیل ہے کہ انہوں نے باوجود اشرف کے سیاسی خیالات سے اختلاف کے

انھیں واپس آنے کا موقع دیا۔ وہ اشرف کے بال بچوں کی شروع سے مدد کرتے رہے تھے اور ان کے ایک لڑکے کو انہوں نے برسوں اعلیٰ تعلیم کے لئے اپنے پاس سے روپیہ دیا۔ غالباً ۱۹۵۸ء میں وہ ہندوستان واپس آئے۔ حکومت کشمیر نے انہیں کشمیر کی تاریخ لکھنے کے لئے مامور کیا۔ مگر وہ یہ کام شروع ہی کر پائے تھے کہ کروڑی مل کالج دہلی میں تاریخ کے ریڈر مقرر ہو گئے۔ انہوں نے بہت جلد دہلی کے علمی حلقوں میں اپنی ایک جگہ بنالی اور بڑی یکسوئی اور انہماک سے لکھنے پڑھنے لگے۔ عملی سیاست میں انھوں نے ہندوستان واپس آنے کے بعد کوئی حصہ نہیں لیا۔ اب ان کے دوستوں اور شناساؤں کو یہ امید ہو چلی تھی کہ اشرف تاریخ ہند پر اپنا قیمتی مواد مرتب کرکے شائع کرسکیں گے۔ گزشتہ ۱۹۶۰ء میں انھیں ایسٹ برلن کی ایک یونیورسٹی میں مہمان پروفیسر کی حیثیت سے بلایا گیا اور غالباً اپنی بیوی کے اصرار پر وہ چلے گئے۔ دسمبر ۱۹۶۱ء میں جب علی گڑھ میں آل انڈیا ہسٹری کانگریس کا سالانہ اجلاس ہوا تو اشرف برلن سے اس کے ازمنۂ وسطیٰ کے شعبے کی صدارت کے لئے آئے تھے اور اس موقع پر انہوں نے ایک نہایت خیال انگیز خطبہ بھی پڑھا تھا۔ اس وقت ان کا خیال یہ تھا کہ وہ دو تین سال برلن میں رہنے کے بعد ہندستان واپس آجائیں گے۔ چند روز ہوئے ان کا ایک خط بھی برلن سے آیا تھا جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ وہ ۱۹۶۲ء میں جن قومی اور جشن کانگریس کے اجلاس میں شرکت کے لئے ضرور آئیں گے میں اس خط کا جواب بھی نہ دے پایا تھا کہ اخبار میں ان کی موت کی خبر آگئی۔

اشرف علی گڑھ کے ان فرزندوں میں سے تھے جن کی قابلیت اور صلاحیت کا دوست دشمن سب کو اعتراف تھا۔ معلوم نہیں عملی سیاست میں اشرف کا کیا کارنامہ ہے لیکن یہ واقعہ ہے کہ اگر وہ اپنی ذہانت اور قابلیت کو علمی کاموں ہی میں صرف کرتے تو ہندوستان کو ایک اور بڑا مورخ مل سکتا تھا۔ ہمارے ملک میں تنگ نظری بہت ہے۔ ہم سیاسی اختلافات برداشت نہیں کر پاتے۔ ہمارے یہاں ڈاکٹر رادھا کرشنن، پنڈت جواہر لال نہرو، ڈاکٹر دیش مکھ، ڈاکٹر ذاکر حسین، پنڈت کنزرو، تارا چند، حفظ الرحمن جیسے کتنے لوگ ہیں جو سیاسی اختلافات کے باوجود اچھے اور قابل لوگوں کی قدر کرتے ہیں۔ اشرف نے اپنی زندگی میں خاصی تکلیفیں جھیلیں۔ انہوں نے نا اہلوں کو سرفراز ہوتے دیکھا مگر ان کے حصے میں محرومیاں زیادہ آئیں۔ ان کے مزاج میں جو طنز کی لہر آگئی تھی وہ تجربات کی ایسی ہی تلخی کی وجہ سے تھی۔ گو ایک مقالے کے علاوہ اشرف کا کوئی مستقل کارنامہ نہیں ہے مگر ان کے انگریزی اور اردو کے مضامین اگر جمع کئے جائیں تو دو قابل قدر کتابیں تیار ہو سکتی ہیں۔ مسلم فرقہ پرستی پر اشرف کے مدلل مضامین پوری کتابوں پر بھاری ہیں۔ وہ بڑی شگفتہ، رواں اور پرزور نثر لکھتے تھے۔ انہوں نے فارسی اور اردو کے کلاسیکل ادب کا بڑا رچا ہوا مذاق پایا تھا۔ مولانا محمد علی کے متعلق کسی نے کہا تھا کہ وہ غیر معمولی آدمی تھے مگر ان کا کوئی کارنامہ نہیں ہے۔ شاید یہ بات اشرف پر بھی صادق آتی ہے۔ یوں بھی محمد علی اور اشرف میں ایک رشتہ ہے۔ اس کی طرف اشرف نے اپنے ایک مضمون "شخصیات و واقعات جنھوں نے مجھے متاثر کیا" میں اشارہ بھی کیا تھا۔

تاریخ کو کچھ لوگوں نے واقعات کی کھتونی، کچھ نے مشاہیر کی سوانح عمری، کچھ نے ایک ہلکا پھلکا آرٹ اور کچھ نے ایک مشکل سائنس کہا ہے۔ جدید دور میں تاریخ کی معروضیت پر بڑا زور دیا گیا ہے۔ جیسے ویلکو کہہ رہا ہے کہ خود کچھ نہ کہو واقعات کو سب کچھ کہنے دو۔ یہ کوشش قابل قدر ہے، مگر واقعات کے انتخاب میں، معنی خیز اور سطحی پہلوؤں کے الگ الگ کرنے میں، ہلکے اور گہرے رنگ استعمال کرنے میں، کچھ نہ کچھ داخلیت آہی جاتی ہے۔ ٹوائن بی اور اسپنگلر ہوں یا مارکس اور اینگلز، کالنگ ووڈ اور کار ہوں یا سرکار و پانی کر سب اپنے آئینے میں حقیقت کا نظارہ کرتے ہیں اور آئینے کا رنگ اس حقیقت پر بھی رنگ آمیزی کرتا ہے۔ ہاں دیکھنا یہ ہے کہ کس کے آئینے میں تہذیب کے ارتقا کی، سماج کی تبدیلیوں کی، قوموں کے عروج و زوال کی تصویر بھی ملتی ہے۔ بادشاہوں کے جشن و جلوس کی داستان بھی عوام کے مادی و روحانی وسائل کی روشنی میں معنی خیز ہوتی ہے۔ اشرف تاریخ میں مارکسی نظریۂ حیات کے ماننے والے تھے۔ اس نظریے کو کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے، مگر ہماری تہذیبی بساط سے جن لوگوں کو دلچسپی ہے اور جو اس کے نقش و نگار کی جڑت میں ایک بنیادی وحدت کے دیکھنے والے ہیں، انھیں اشرف کے مقالات میں گہرائی بھی ملے گی اور گیرائی بھی اور ان کے پڑھنے والے مشترک تہذیب کے اس عاشق، فرقہ پرستی کے خلاف لڑائی کے اس سورما اور تحریر و تقریر کے اس مرد میدان کو بھلانا چاہیں گے بھی تو آسانی سے نہ بھلا سکیں گے۔

بکر جامی

صلیب

اور ہم شاعر و ادیب

— سانیٹ —

کتنے غم ، جانفزا اُٹھائے ہیں
ہم نے اپنے وسیع سینوں میں
اور نہائے ہوئے پسینوں میں
ہم نے محنت کے گیت گائے ہیں

گیت اوروں کے واسطے لکھے
اور اپنے لیے نہ کچھ چاہا — !
منزل کر سکے گا کیا بچا ہا
زخم کاری ہیں ہم ادیبوں کے

ایک جذبہ ہے ایک سودا ہے
ورنہ کیوں کوئی جان دیتا ہے
کون یوں ہی "زبان" دیتا ہے
غم دنیا کو اپنا سمجھا ہے

وہ جو ناقص ہیں ذل سے اُترے ہیں
ہم وہ ہم وار سے بھی گذرے ہیں

ایم کے ضیا دی راہی

گل ناشگفتہ

(اپنے معصوم بھانجے کی علالت سے متاثر ہو کے)

میں نے تو کچھ نہ کیا
مجھ سے تو کچھ نہ ہوا

جذبہ اخلاص و خرافات ہوئی
دیوتا میرے ! جوانی میری
اُف میں کس مُنہ سے کہوں
ہائے دُکھتا ہے مرا
کیتے ہوئے دل اب تو
نہ تو اپنا ہی بنا
نہ تو تیرا ہی بنا
نہ جہاں کا — افسوس !
یوں ہی ہر ایک بہار
ہو گئی آخر کار
رخصت افسوس — مگر —
دیوتا ! تو نے کرم کچھ نہ کیا
کاش زیست میں ہر لمحہ بگولے اُٹھتے
اور آکاش سے چنگاریاں برسیں
غنچے جلتے ہی رہے
پھول جنم پا نہ سکے —"
میں نے تو کچھ نہ کیا
مجھ سے تو کچھ نہ ہوا۔

مجھ کو مجبور بنانے والے
میری سوچوں کو ارادوں کو جلانے والے
دیوتا میرے ! — میرے سانس بھی لے لے مجھ سے
"طفل نوخیز" کو میرے مگر اچھا کر دے۔
میں نے تو کچھ نہ کیا
مجھ سے تو کچھ نہ ہوا

غزل

سید حرمت الاکرام

رہے جو عقل کے سینے پہ تا ابد یہ داغ
کہ زندگی نے کبھی پا یا نہ زندگی کا سُراغ

عجب طرح گذارا ہے دورِ تیرہ شبی
جلا جلا کے بجھائے ہیں ہم نے کتنے چراغ

ابھی تو بات بہت زندگی کی باقی ہے
بجھے بجھے نظر آتے ہیں کیوں ابھی سے چراغ

تمہیں بتاؤ کہ اس میں کیف ہے کتنا
میں جانتا ہوں کہ خالی نہیں کسی کا ایاغ

میں جی رہا ہوں حوادث کی گود میں حرمت
کہ مل سکا نہ مسرت میں زندگی کا سُراغ

حسرت کاظمی نگینوی

اُن کی آنکھوں میں یوں اشک چھلکے
جس طرح اوس پھولوں سے ڈھلکے

احتیاطِ محبت بھی لغزش
گر گئے اور بھی ہم سنبھل کے

رنگ آغازِ عشق اللہ اللہ
پھول کھلتے ہوں جیسے کنول کے

حسرت ان کی جدائی کا عالم
بجھ گئے ہم دیے جیسے جل کے

عاصی رام پوری

چمن پہ فصلِ خزاں کا نہ اختیار چلے
کچھ اور روز ابھی موسمِ بہار چلے

نہ چھوڑا گردشِ ایام نے ہمارا ساتھ
گئے جہاں بھی حوادث بھی ہم کنار چلے

غمِ جہاں غمِ جاناں غمِ مآلِ حیات
جہاں کہیں بھی چلے ہم تو غمگسار چلے

زمانہ چلا نہ چلے مگر تم اے عاصی
گناہ گار رہے اور گناہ گار چلے؟

طلعت یاسمین شبنم

زخم کھاتے جائیے اور مسکراتے جائیے
دل کا ویرانہ کسی صورت سجاتے جائیے

یہ بھی آئینِ الفت ہے یہی دستورِ عشق
اشک پیتے جائیے اور مسکراتے جائیے

دے رہی ہے ہم کو شبنم یہ سبق اب تشنگی
بے رخی کو مسکرا کر گل کھلاتے جائیے

انجمن ترقی اردو راجستھان کی سہ سالہ رپورٹ

انجمن ترقی اردو ہند شاخ راجستھان کا قیام ۲۰ مارچ ۱۹۵۶ء کو عمل میں آیا ہے۔ اس کی پہلی سہ سالہ رپورٹ ابتدائے یکم اپریل ۱۹۵۶ء نہایت ۳۱ مارچ ۱۹۵۹ء شائع ہو چکی ہے۔ اب یہ دوسری رپورٹ ابتدائے یکم اپریل ۱۹۵۹ء نہایت ۳۱ مارچ ۱۹۶۲ء پیش کی جاتی ہے۔

اس سلسلے میں ضروری معاملات کی تفصیل عرض کرنے سے قبل دونوں سہ سالہ مدتوں کے متعلق ایک گوشوارہ بطور موازنہ کار پیش کیا جاتا ہے:-

عرصۂ کار	تعداد ممبران انجمن	تعداد [illegible]	تعداد [illegible]	تعداد اجلاس ہائے منعقدہ	[illegible]	[illegible]	تعداد [illegible]	تعداد [illegible]	تعداد خط و کتابت	رقم: آمد: پیسہ	آمد: روپیہ	خرچ: پیسہ	خرچ: روپیہ	بقایا: پیسہ	بقایا: روپیہ
گذشتہ سے پیوستہ (یکم اپریل ۵۶ء نہایت ۳۱ مارچ ۵۹ء)	۳۱	۱	۲	۸	۵۷	۱۱	۳۹	۷	۳۹۶۲	۳۱	۱۱۸۲	۲۷	۱۱۶۳	۹۳	۷۵۷
گذشتہ (یکم اپریل ۵۹ء نہایت ۳۱ مارچ ۶۲ء)	۵۱	۶	۳	۷	۹۳	۶۰	۶۵	۱۵	۳۶۱۸	۱۸	۳۵۷۴	۶۲	۲۴۳۳	۵۱	۹۴۰

مثل گذشتہ سہ سالہ پیوستہ کے عرصہ گذشتہ تین سال کی مدت میں بھی انجمن برابر انہیں مطالبات کی عملی کامیابی کیلئے کوشاں رہی کہ جو مئی ۱۹۵۸ء کے "کل راجستھان اردو کنونشن" میں منظور کئے گئے۔ مثلاً:-

مادری زبان کی تعلیم اس کی بابت ۲۸ فروری ۱۹۶۰ء کو حکومت راجستھان نے حکم نمبر F.11(12)Edu/R/58 جاری کیا اور مضمون کا پریس نوٹ بھی کہ جہاں اقلیتی طبقہ کے طلبہ کی تعداد کسی ایک کلاس میں دس ہو یا پورے اسکول میں چالیس وہاں ان کو ان کی مادری زبان (اردو) میں تعلیم دی جائے اور اس حکم پر جولائی ۱۹۶۰ء سے لازمی طور پر عمل شروع کرا دیا جائے۔ یہ حکم ڈائرکٹر صاحب محکمہ تعلیم میں پہنچنے پر انجمن نے ان کی خدمت سے مزید تشریح کے ساتھ جلد جلد عمل [illegible] احکام جاری ہو گیا کہ درجہ اول سے درجہ پنجم کی تمام طلباء اردو کی ادبی کتابیں پڑھائی جائیں۔ حکومت نے [illegible] بھی ہے کہ اردو کو سنسکرت کے ساتھ [illegible] کیا جائے۔ اور ایسے اسکولوں میں اردو کی کتابیں [illegible] خریدی جائیں۔ درجہ ششم سے درجہ ہفتم تک بھی اختیاری مضمون کی حیثیت سے اردو پڑھی جا سکتی ہے۔ پھر ڈپٹی ڈائرکٹر صاحب سررشتہ تعلیم جے پور کے دفتر سے یہی حکم جاری کرایا گیا۔ نیز انسپکٹر صاحب مدارس حلقہ مشرقی ضلع جے پور کے یہاں سے بھی سائکلو اسٹائل شکل میں جاری ہوا اس حکم میں یہ بھی درج تھا کہ "اس انسپکٹریٹ کے ماتحت تمام اسکولوں کے ہیڈ ماسٹروں سے امید کی جاتی ہے کہ وہ اپنے اسکولوں میں اس کو عمل میں لانے میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھیں گے کسی بھی ہیڈ ماسٹر کی طرف سے اگر کوئی کوتاہی یا سستی پائی گئی تو وہ اس کے لئے تکلیف دہ ثابت ہوگی۔" بلکہ بعض جے پور کے اسکولوں میں خود کارکنان انجمن نے اپنے ہاتھ سے پہنچا دیا۔ انجمن نے اپنی جملہ شاخوں کو راجستھان گورنمنٹ کے حکم اور پریس نوٹ کی نقلیں بھی بھیج دیں۔ اور چند [illegible] پوسٹر و کتابچہ کی شکل میں بھی شائع کر دیا۔ تاہم مختلف مقامات سے حسب ذیل قسم کی شکایات آتی رہیں اور آرہی ہیں۔

(۱) بعض انسپکٹران اسکولس نے یہ احکام اپنے ماتحتان کو جاری نہیں کئے۔

(۲) بعض نے ایسا کوئی حکم اپنے دفتر میں نہ پہنچنا ظاہر کیا۔

(ج) جہاں اُردو پڑھنے والے طلبہ تھے وہاں سے اُردو پڑھانے والے ماسٹر تبدیل کرکے ایسے ٹیچر مامور کر دیے گئے جو اُردو نہیں جانتے۔

(د) اُردو پڑھانے والے ٹیچر نہ ہونے کے باعث اُردو میں تعلیم جاری نہ کرنے کا عذر کیا گیا۔

(ہ) گورنمنٹ آرڈر کے صحیح معنیٰ نہ لئے گئے۔ اور نادرست ترجمانی کی گئی۔

(و) تقریباً سبھی جگہ درجہ سوم سے آگے اُردو تعلیم کا انتظام نہیں ہوا۔

(ز) اردو کی کتابوں کے علاوہ دیگر مضامین کی کتابیں اب تک نامزد نہیں ہوئیں۔

(ح) کتابوں کا اندراج سلیبس میں نہیں کیا گیا۔

(ط) کتابوں کے دستیاب ہونے کا کوئی انتظام نہیں ہے۔

(ی) یہ بھی شرط عائد کی گئی تھی کہ مادری زبان کے متعلق باضابطہ حلف نامہ پیش کیا جائے اور یہ بھی کہ اسکول کے لئے عمارت دی جائے یا اس کا کرایہ ادا کیا جائے۔ ان احکام کی تنسیخ انجمن ہذا ہی نے خط و کتابت کرکے کرائی۔

(ک) بعض ہیڈ ماسٹران طلبہ کے سرپرستوں کو بہکا دیتے ہیں کہ اُردو پڑھنے میں ان کا نقصان ہے۔ اس طرح کہ بچہ جب درجہ پنجم تک اُردو پڑھتا چلا آئے گا تو درجہ ششم میں وہ ہندی نہ پڑھ سکے گا۔ لہٰذا تعلیمی معاملات سے ناواقف لوگ اُردو چھڑوا کر ہیڈ ماسٹروں کی خوشنودی حاصل کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ درآنحالیکہ یہ مشورہ قطعاً غلط اور احکام حکومت کے خلاف ہے۔ اس لئے کہ اسی حکم میں یہ بھی درج ہے کہ درجہ سوم سے ہندی بھی بطور لازمی مضمون (صرف زبان) پڑھائی جائے گی تاکہ بچہ درجہ ششم میں پہنچ کر کمزور نہ رہے۔

اُردو کے ماسٹر نہ ملنے کا عذر بھی قطعاً بے اصل ہے۔ اس لئے کہ کئی جگہ ارکان انجمن نے اس عذر کی تردید میں اسی حلقہ میں ایسے اُردو کے ماسٹروں کی نشاندہی کردی ہے کہ جن کو اُردو سے ہٹا کر دوسری جگہ ہندی پڑھانے کے لئے بھیج دیا گیا۔ اور بفرض محال ایسا ہی ہے تو ایسی "وانٹ" مشتہر کی جا کر بآسانی خاطر خواہ ٹیچر حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ اس لئے کہ راجستھان میں اُردو تعلیم کے لئے تعلیم یافتہ ضرورتمندان ملازمت کی کمی نہیں ہے۔ اگر سررشتۂ تعلیم چاہے تو اس سلسلہ میں انجمن ہذا بھی اساتذہ کی بہم رسانی کی خدمت انجام دے سکتی ہے۔

مذکورالصدر شکایات کے ذیل میں۔ کمرانہ، بانسی، دوسہ، کچامن، سوجت، بدنپور، جالنہ اور دیگر متعدد مقامات کے واقعات پیش کئے جا سکتے ہیں۔

ان شکایات کو رفع کرنے کے سلسلے میں انجمن ہذا ریاستی اور مرکزی حکومتوں کے متعلقہ اداروں سے برابر خط و کتابت کرتی رہی۔

اسی سلسلے میں ۱۳ کو ایک وفد انجمن بھی چیف سکریٹری صاحب راجستھان سے مل چکا ہے۔ اور اُن کے ارشاد کے اتباع میں ایسے ۱۰۴ پرائمری اسکولوں کی فہرست بھی پیش کردی ہے جن کے متعلق حسب شرح بالا شکایات ہیں۔ اور دوسری فہرست ایسے ۵۴ مڈل اسکولوں کی بھی پیش کی ہے جن میں حسب احکام حکومت تعلیم اُردو کا انتظام نہیں ہے۔

تمام شکایات کا لب لباب یہ ہے کہ حکومت کے حکم کی خاطر خواہ تعمیل نہیں ہو رہی ہے۔ اور انجمن کی تمام تر کوشش یہی ہے کہ واقعی طور پر تعمیل حکم ہو جائے۔

راجستھان کے متعدد ہائی اسکولوں میں اُردو جاری ہے مگر کورس کی کتابیں نہ ملنے کی ان میں بھی شکایت ہے۔

مہارانیہ کالج جے پور۔ بھوپال کالج اودے پور۔ گورنمنٹ کالج ٹونک اور سری کلیان کالج سیکر کے بی۔ اے کلاسوں میں بھی اُردو جاری ہے۔ مگر راجستھان بھر میں ایم۔ اے میں کہیں نہیں ہے۔ لہٰذا اس کی بابت رجسٹرار صاحب راجستھان یونیورسٹی کو لکھا گیا۔ ان کا جواب آیا کہ اگر بیس طلبہ اُردو لینا چاہیں اور آئندہ بھی ملتے رہیں تو منظوری حاصل کرنے کی کارروائی شروع کی جا سکتی ہے۔ یہ شرط اگرچہ سخت تر اور غیر ضروری تھی جبکہ موجودہ حالت میں بعض مضامین میں ایم۔ اے کلاسوں میں صرف ۲-۵ اور ۳ تک طلبہ پڑھتے ہیں۔ تاہم ۱۵ طلبہ کی درخواستیں پیش کی گئی ہیں اور فیصلہ اخیر کا انتظار ہے۔

لائبریریوں میں اُردو کی کتابوں کی عدم خریداری

متعدد مقامات سے ایسی شکایات وصول ہوئی ہیں کہ باوجود مطالبہ اور اُردو کی کتابوں کے لئے رقم منظور ہونے کے، اُردو کی کتابیں لائبریریوں میں نہیں خریدی جاتیں لہٰذا اس بابت بھی خط و کتابت جاری ہے۔

اُردو کی درخواستیں

اُردو کی درخواستیں دفاتر میں قبول کئے جانے کی بابت حکومت راجستھان کا سرکلر گزٹ تاریخی دسمبر ۱۹۶۱ء میں شائع ہو چکا ہے جس کی نقل اور ترجمہ انجمن ہذا اپنی تمام شاخوں کو بھیج چکی ہے۔ اور ذریعہ پوسٹر ہینڈ بل کتابچہ اور کئی اخبارات میں بھی شائع کر چکی ہے۔ اس سلسلے میں جو شکایات وصول ہوئیں وہ بھی حکام کو بھیجی جا چکی ہیں تاہم یہ سلسلہ جاری ہے اور تعمیل حکم نہیں کی جاتی۔

اُردو دستاویزات کی نقول اُردو میں دی جاتی ہیں

اس کی بابت راجستھان گورنمنٹ نے حکم جاری کر دیا ہے اور انجمن ہذا بھی حسب شرح بالا اس سے اُردو دوستوں کو مطلع کر چکی ہے۔ اس حکم پر عمل ہو رہا ہے اور کوئی شکایت کہیں سے وصول نہیں ہوئی۔

خاص خاص قوانین و اعلانات اُردو میں بھی شائع کیے جائیں

اس کی بابت گورنمنٹ راجستھان کا حکم "سپلیمنٹ راجستھان گزٹ تاریخی ۱۱ر اگست سنہ ۶۰ء نمبر ۱۹ حصہ اول حرف " میں شائع ہو چکا ہے مگر اب تک کوئی قانون یا اعلان شائع نہیں ہوا۔

واضح رہے کہ ہر سہ امور مذکور کی بابت انجمن ہذا نے حکام مجاز سے مسلسل اور کافی خط و کتابت کی ہے جس کے نتیجہ میں یہ احکام جاری ہوئے ہیں۔ صرف ایک کتاب الموسوم بہ "راجستھان پولیس کی کہانی" مرتبہ راقم الحروف راجستھان گورنمنٹ کے خرچ پر شائع ہوئی ہے۔ اور دونوں گذشتہ پنج سالہ منصوبوں کے تحت جو ترقیاتی کام ریاست راجستھان میں ہو گئے ہیں اور موجودہ تیسرے پنج سالہ منصوبے کی جو اسکیمیں ہیں ان کا بھی اُردو ترجمہ حسب خواہش پبلک ریلیشن ڈائریکٹر صاحب راجستھان انجمن ہذا ہی کے زیر اہتمام کیا گیا ہے۔ وہ شاید شائع ہو جائے گا۔ مگر یہ نہ قانون و قواعد ہیں نہ اعلان و اشتہار۔ مقصد یہ کہ اس حکم پر بھی کوئی عمل نہیں ہوا ہے۔

مردم شماری سنہ ۱۹۶۱ء

سب سے بڑا کام جو گذشتہ تین سال میں انجمن ہذا نے انجام دیا ہے وہ سنہ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری ہے۔

اس سلسلہ میں ایک مفصل کتابچہ بھی شائع کیا گیا۔ کثیر تعداد میں ہینڈبل بھی تقسیم کیے گئے۔ پوسٹر بھی چسپاں کرائے گئے۔ راجستھان کے مختلف مقامات سے معلومات بھی بہم پہنچائی گئیں۔ انجمن کے حکم سے راقم الحروف نے بیکانیر، جودھ پور، ناگور، بانسواڑہ، چورو، سیکر، ٹونک، اجمیر، بھیلواڑہ، چتوڑ، اودے پور، ڈونگر پور، منوہر پور، اور دیگر مقامات کا دورہ بھی کیا۔ منشی عبدالواسع صاحب کو بھی دورہ۔ سانگانیر اور دیگر کئی مقامات مثل نرائنہ، معظم آباد اور دودو وغیرہ بھیجا گیا۔ پارٹ ٹائم تنخواہ دار کلرک بھی رکھا گیا۔ متعدد مشاورتی میٹنگیں بھی کی گئیں۔ جودھ پور ڈویژن کا کام خان محمد حمید اللہ خاں صاحب نے سنبھالا۔ انھوں نے اضلاع میں دورے کیے۔ خاص توجہ اور دلچسپی سے ہر معاملہ پر نظر رکھی۔ ماتحت کارکنان محکمہ مردم شماری کی بے عنوانیوں اور زیادتیوں سے مقامی حکام اور انجمن ہذا کو برابر مطلع کیا۔ انجمن ہذا کا ایک وفد بھی چیف سکریٹری صاحب راجستھان سے ملا۔ راقم الحروف تو کئی بار سپرنٹنڈنٹ صاحب مردم شماری راجستھان اور دیگر افسران اعلیٰ و ادنیٰ سے ملتا رہا۔ اور ہر معاملہ کے متعلق پیش آنے والی شکایات ان تک وقتاً فوقتاً تحریری شکل میں پہنچائی جاتی رہیں۔ جوائنٹ سکریٹری صاحب نے قابل قدر و مستحق شکریہ میری پوری مدد کی اور اسی طرح اسسٹنٹ سکریٹری صاحبان اور دیگر ارکان انجمن اور دوسرے اُردو دوست اصحاب نے اعانت فرمائی۔ مثلاً عارف صاحب بیکانیری نے میرے ساتھ چورو تک دورہ کیا۔ بیکانیر کی شاخ کے کارکنوں نے اور اسی طرح دوسری مقامی شاخوں کے ارکان نے میرا ساتھ دیا۔ میں ان سب کا شکرگزار ہوں۔ غرض اس معاملے میں اُردو والوں نے اچھا خاصا تعاون کیا اور پوری دلچسپی سے امداد کی۔ لہٰذا یہ کہنا تو زائد ہوگا کہ کہیں کوئی زیادتی یا بے عنوانی نہیں ہوئی ہے۔ کیونکہ انجمن ہذا نے خود ایک طویل فہرست ان شکایات کی جو اس سلسلے میں پیش آئی تھیں۔ ڈائریکٹر جنرل صاحب محکمہ مردم شماری ہند اور دیگر اعلیٰ افسران گورنمنٹ ہند و حکومت راجستھان کو بھیجی ہے۔ البتہ جہاں تک سپرنٹنڈنٹ صاحب مردم شماری راجستھان اور منسٹر صاحب انچارج مردم شماری راجستھان کے احکام کا تعلق ہے وہ سب قابل اطمینان اور تسلی بخش جاری ہوئے ہیں۔ اس لئے امید تو اچھی ہی کی جاتی ہے۔ صحیح حال نتیجہ شائع ہونے پر معلوم ہوگا۔ جس کا انتظار ہے۔

امتحانات مقابلہ

امتحانات مقابلہ کے سوالات کے جواب اُردو میں لکھنے کی اجازت تو بے شک نہیں ملی جیسا کہ انجمن کا مطالبہ تھا۔ البتہ اب ہندی لازمی مضمون کی حیثیت سے نہیں رہی ہے۔ اور فارم میں ایک ایسا خانہ بڑھا دیا گیا ہے جس میں امیدوار اپنی مادری زبان کا اظہار کر دیتا ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ ہندی میں اگر وہ فیل ہو جاتا ہے۔ یا اس مضمون کو چھوڑ دیتا ہے۔ تو آئندہ اس میں مہارت ہونے کا امتحان دے سکتا ہے۔

(باقی)

انجمن ترقی اردو۔ لکھنؤ

انجمن ترقی اردو لکھنؤ کا جلسہ خصوصی زیر صدارت سلطانہ حیات صاحبہ دفتر انجمن جلسہ تہذیب لائبریری رفاہ عام میں منعقد ہوا۔ اردو کے موجودہ مسائل پر ڈاکٹر محمد یٰسین نے کئی تجاویز پیش کیں۔ ان تجاویز پر حیات اللہ انصاری، سلطانہ حیات، ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی، سید امیر حسن نورانی، گیانی مہیندر سنگھ اور سخاوت علی صدیقی نے اپنی اپنی رائے کا اظہار کیا۔ آخر میں متفقہ طور پر یہ طے پایا کہ درسی کتابوں کے مسائل پر ڈاکٹر محمد یٰسین صاحب کو اس امر کا مجاز کیا جائے کہ وہ عام مضامین کی کتابوں کے متعلق تفصیلی رپورٹ پیش کریں۔

ایک دوسری تجویز کے ذریعہ انجمن ترقی اردو ہند سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ

"صدر جمہوریہ کو اردو کو علاقائی زبان بنانے کے سلسلے میں اب سے سات آٹھ برس پہلے ۲۰ لاکھ دستخطوں سے جو توجہ نامہ پیش کیا گیا تھا اور جس کا جواب ابھی تک نہیں دیا گیا، کل ہند انجمن ترقی اردو صدر جمہوریہ سے جواب عنایت کرنے کی جلد از جلد درخواست کرے۔"

جلسے میں اس پر بھی غور کیا گیا کہ انجمن ترقی اردو اتر پردیش کی کونسل کا اجلاس کانپور میں ۱۷ر جون ۱۹۶۲ کو کیا جائے جس میں ابتدائی تعلیم اور درسی کتابوں کے مسائل پر غور کیا جائے۔

عثمانیہ یونیورسٹی سے اردو کالج کو ملحق کرنے کی درخواست

حیدرآباد۔۔۔ اردو آرٹس کالج اردو ہال حمایت نگر کے ایک پریس نوٹ میں بتایا گیا ہے کہ اردو آرٹس کالج کے قیام اور ماہ جون میں بی۔ یو۔ سی (آرٹس) کی جماعتوں کو شروع کرنے کے سلسلہ میں عثمانیہ یونیورسٹی میں درخواست پیش کر دی گئی ہے تاکہ اس کالج کا جلد از جلد عثمانیہ یونیورسٹی سے الحاق عمل میں لایا جائے۔ یونیورسٹی کے قواعد کے مطابق یونیورسٹی کے مقرر کردہ ایک کمیشن کی رپورٹ کے بعد اس کالج کا یونیورسٹی سے الحاق ہوگا۔ الحاق کے لئے جو دو بنیادی شرائط سرمایہ اور عمارت سے متعلق ہیں گورننگ باڈی نے ان دونوں شرائط کی تکمیل کر دی ہے۔ پریس نوٹ میں آگے چل کر بتلایا گیا ہے کہ اردو آرٹس کالج میں ماہ جون کے آخری ہفتہ سے باضابطہ تدریس شروع ہو جائے گی جن مضامین میں تعلیم کا انتظام کیا جائے گا اور طلباء کے داخلے کے لئے جو شرائط ہیں اس کا اعلان عنقریب کیا جائے گا۔

اردو کالج کے قیام کا خیر مقدم

حیدرآباد ۵ر جون۔ انجمن طلبہ قدیم جامعہ عثمانیہ کی مجلس عاملہ کا اجلاس زیر صدارت مسٹر حبیب اللہ ری ایم اے (عثمانیہ) منعقد ہوا۔ جس میں اردو آرٹس کالج کے قیام پر انجمن ترقی اردو اور کالج کی گورننگ باڈی کے اراکین کو مبارکباد دیتے ہوئے اپیل کی گئی کہ اس کالج کو زیادہ موثر طور پر کامیاب بنانے کے لئے جب اس کے اوقات شام کے رکھے گئے ہیں تو بی۔ یو۔ سی کے ساتھ ہی سہ سالہ ڈگری کورس بھی آغاز کیا جائے۔ ایسی صورت میں دفاتر کے کام کرنے والے سینکڑوں افراد فوری داخلہ حاصل کر سکیں گے اور جن کی تعلیم اردو کے ختم ہونے کے باعث رک گئی ہے وہ بھی تعلیم جاری رکھنے کے قابل ہو جائیں گے۔

انجمن تعمیر اردو کی مئی ۶۲ء کی ادبی کارگذاری

ماہ مئی میں حسب معمول ہر اتوار کو انجمن کی نشستیں منعقد ہوتی رہیں۔ ۶ر مئی کو منشی عبدالقدیر صاحب نے ۱۳ر مئی کو پنڈت سندر لال نے، ۲۰ر مئی کو جگن ناتھ آزاد صاحب نے، ۲۷ر مئی کو علامہ نازر صاحب دہلوی نے اور ۳ر جون کو ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے صدارت فرمائی۔ ۱۱۳ مختلف ادبا و شعراء نے گذشتہ پانچ نشستوں میں شرکت فرمائی، جن میں دلی اور بیرون دلی کے مختلف مشاہیر اور ہند و پاک کے ممتاز اہل قلم شامل ہیں۔

آندھرا میں انگریزی سے ناواقف اردو داں ملازمین کی برطرفی کا مسئلہ

۳ر جون۔ مجلس بلدیہ حیدرآباد کے آزاد گروپ کے لیڈر مسٹر کے لکشمی نارائن اور پی۔ ایشور رکن بلدیہ نے انگریزی سے ناواقف اردو داں ملازمین کی سبکدوشی کے سلسلہ میں ریاستی حکومت کے فیصلہ کی مخالفت کی ہے۔ دونوں ارکان بلدیہ نے پانچ سے تا دس سال کی مدت میں لازمی طور پر سبکدوش ہونے والے صرف اردو داں ملازمین کو نت نئے احکام اور ہدایتوں کے ذریعہ پریشان کرنے کی پالیسی پر گہری تشویش کا اظہار کیا اور کہا کہ ان ملازمین کو زبان کی امتحانات غیر انگریزی داں۔ غیر تلگو داں اور اصلاح نظم و نسق کے نام پر مسلسل نقصان پہنچانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ اس زیر بحث دل آزار حکمت عملی کی فوری تنسیخ کے ذریعہ ریاست کے لاکھوں اردو بولنے والوں میں پیدا شدہ بے چینی کو دور کیا جائے ورنہ اردو کے تعلق سے ریاستی حکومت کی اختیار کردہ پالیسی کے بارے میں شکوک و شبہات اور بدگمانیوں میں مزید اضافہ ہوگا۔

وزیر مال کی یقین دہانی

اس سلسلے میں ۵ر جون کو آندھرا پردیش کے ریاستی وزیر مال مسٹر رام چندر ریڈی نے یقین دلایا ہے کہ اردو داں ملازمین کے ساتھ فی الواقع اگر کوئی بے انصافی ہو رہی ہے تو وہ اس کے تدارک کی امکانی کوشش کریں گے۔

ایٹمی اسلحہ کے استعمال کے خلاف گاندھی پیس فاؤنڈیشن کا کنونشن

ایٹمی اسلحہ کے استعمال کی مخالفت میں ایک کنونشن یہاں ۱۶ تا ۱۸ جون کو ہوگا۔ سابق صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد اس کا افتتاح کریں گے۔ اس سہ روزہ بین الاقوامی کنونشن میں دنیا کے ایک سو بیس چوٹی کے مفکر شرکت کر رہے ہیں۔ ہندوستان کے سابق صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد ۱۶ جون کو نئی دہلی میں اس کنونشن کا افتتاح کریں گے۔

یہ کنونشن گاندھی پیس فاؤنڈیشن کی جانب سے بلایا گیا ہے۔ فاؤنڈیشن نے ایک سو بیس سے زائد چوٹی کے مفکروں، فلسفیوں، سائنسدانوں اور ادیبوں کو اس کنونشن میں شرکت کی دعوت دی ہے۔

دوسرے ملکوں کے جن میں چوٹی کے رہنماؤں کو شرکت کی دعوت دی گئی ہے ان میں برٹرینڈ رسل آلڈس ہکسلے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ہندوستان سے اس میں شرکت کرنے والوں میں اچاریہ ونوبھاوے، جے پرکاش نرائن، راج گوپال اچاریہ، راما سوامی آئیر، سردار کے ایم پانیکر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ہندی کے ذریعہ تعلیم ہونے تک انگریزی کو قائم رہنا چاہیئے

نئی دہلی میں ۳ر جون کو قومی یک جہتی کونسل نے اس بات پر زور دیا کہ ہندی کی مکمل توسیع و ترقی ہونے تک اور کل سطح پیمانہ پر یونیورسٹیوں میں ہندی کے ذریعہ تعلیم ہونے تک عبوری دور میں انگریزی زبان بین ریاستی رابطہ کے طور پر برقرار رہنی چاہیئے۔

کونسل نے یہ تسلیم کیا کہ بالآخر ہندی کو یونیورسٹیوں میں ذریعہ تعلیم ہونا ہے لیکن اس نے یہ آگاہی بھی دی کہ ذریعہ تعلیم کی اس تبدیلی سے تعلیم کا معیار نہ گرنا چاہیئے۔

کونسل نے اخبارات کے لئے ضابطہ اخلاق کے ایک مسودہ پر بھی غور کیا۔ اور حکومت سے یہ سفارش کی کہ وہ ایک کمیٹی بنائے جو اخبارات سے صلاح و مشورہ کرنے کے بعد پریس کمیشن کی سفارشات کی روشنی میں ایک ضابطہ اخلاق مرتب کرے۔

یونیورسٹیوں اور تعلیمی اداروں میں داخلہ کے سوال پر کونسل نے کہا کہ یونیورسٹیاں ملک کے اتحاد پر زبردست اثر ڈال سکتی ہیں۔ اور ڈالنا چاہیئے۔ کونسل نے سفارش کی کہ تعلیمی اداروں میں پیدائش کے مقام رہائش، ذات پات کی بنیاد پر داخلہ میں کوئی تفریق نہ کی جانا چاہیئے صرف ان افراد کو داخلہ میں ترجیح دی جا سکتی ہے جن کے بارے میں دستور ہند میں تذکرہ ہے۔

یونیورسٹیوں میں ذریعہ تعلیم کے مسئلہ کا تذکرہ کرتے ہوئے کونسل نے انگریزی کو بحیثیت لازمی زبان پڑھائے جانے کی اہمیت پر زور دیا۔ کونسل نے اس بات پر زور دیا کہ خواہ عبوری دور ہو خواہ علاقائی زبان کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے اور خواہ مستقبل میں جب ذریعہ تعلیم پوری طرح بدل گیا ہو انگریزی کی اہمیت باقی رہے گی۔

کونسل نے اس توقع کا اظہار کیا کہ انگریزی بین الاقوامی رابطہ کی ایک کڑی کی حیثیت سے ہمیشہ اہم زبان رہے گی لیکن ملک کے اندر کے رابطہ کے ذریعہ کی حیثیت سے اس کی اہمیت کم ہوتی جائے گی اور جوں جوں ہندی ترقی کرتی جائے گی اس کی جگہ لیتی جائے گی۔

اس لئے کونسل نے یہ سفارش کی کہ یونیورسٹی کی سطح پر لڑکوں میں ہندی کی زیادہ مہارت پیدا کی جاتی رہے۔ لیکن ان کو انگریزی کی ایسی تعلیم بھی دی جائے تاکہ وہ اس زبان میں دئے گئے لکچر سمجھ سکیں۔

کونسل نے وزرائے اعلیٰ کی کانفرنس کی اس سفارش کو دہرایا کہ انگریزی اور ہندی دونوں کے معیار تعلیم کو بلند کیا جائے اور اس بلند معیار کو برقرار رکھا جائے۔

سوویت وسط ایشیا کے آثار قدیمہ میں ہندی تہذیب کے نقوش

بخارا، خوارزم اور ترمیز میں آثار قدیمہ کی چھان بین کرنے والوں نے قدیم ہندوستانی تہذیب کے بہت سے نمونے اور بدھ مت کے مٹھوں کے کھنڈر دریافت کئے ہیں۔ وہاں دیوتاؤں اور شبیہوں کے ٹکڑے ملے ہیں۔ قدیم تحریریں دریافت ہوئی ہیں اور پتھر پر آدمیوں اور جانوروں کے ایسے نقش ملے ہیں جو ہندوستان کی زندگی اور تہذیب سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایسی تصویریں اور مورتیاں بھی ملی ہیں جو قدیم ہندو دیوتاؤں کے تصور سے مشابہ ہیں۔

کنٹر زبان پر سوویت ماہر ہندیات کی کتاب

ماسکو میں مشرقی ادب کے اشاعت گھر نے حال ہی میں سوویت یونین کے ایک ماہر ہندیات میخائل اندرونوف کی ایک کتاب "کنٹر زبان" شائع کی ہے۔ اس کتاب میں کنٹر زبان کے ارتقا کی تاریخ پیش کی گئی ہے۔ کنٹر زبان کی ابتدائی تحریریں پانچویں چھٹی صدی عیسوی میں ملتی ہیں۔ اندرونوف نے عصر حاضر کی ادبی زبان پر زیادہ توجہ صرف کی ہے۔ حروف تہجی صوتیات، صرفیات اور نحو پر خاص ابواب ہیں۔

میخائل اندرونوف نے تامل زبان پر بھی اشاعت کے لئے ایک کتاب مرتب کی ہے۔ اس کتاب کا یہ نام تجویز ہوا ہے: "بول چال کی تامل زبان اور اس کی بولیاں"۔

معاصر

اپنی باتیں

اُردو کے سلسلے میں حکومت کے اعلانات تو بڑے ہمدردانہ اور ہمت افزا ہوتے ہیں۔ ان اعلانات کو پڑھ کر یہ یقین ہو جاتا ہے کہ اُردو زبان کے ساتھ کی جانے والی تمام زیادتیوں کو ختم کر دیا جائے گا۔ اور اس کو بھی آزاد ہندستان میں پھولنے پھلنے کے جلد مواقع ملیں گے۔ لیکن جہاں تک ان اعلانات کو عملی جامہ پہنانے کا تعلق ہے وہ ہنوز روزِ اوّل ہے اور اس میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں پیدا ہوئی۔ اردو اب بھی سرکاری و نیم سرکاری دفتروں، میونسپل بورڈ اور ڈسٹرکٹ بورڈ نیز گورنمنٹ ماڈل اسکولوں جونیر اور سکنڈری اسکولوں سے قریب قریب غائب ہے۔ بیسک اسکولوں میں طلب ہونے ہوئے بھی پڑھائی نہیں جاتی۔ اُردو کتابیں ہمیشہ تاخیر سے شائع ہوتی ہیں۔ کسی اسکول میں بھی ذریعۂ تعلیم اُردو نہیں اور ہو کیسے۔ کورس کی ساری کتابیں ہندی میں پڑھائی جاتی ہیں۔ ہندی میں جوابات لکھائے جاتے ہیں۔ یو۔پی بورڈ کے امتحانات میں اردو میں جوابات لکھنے کے لئے ... کی ضرورت ہوتی ہے یہ اجازت حاصل کرنا جوئے شیر ... سے کم نہیں ہے۔

شکایت ہے اردو پڑھانے والے اساتذہ نہیں ملتے ہیں اور ملیں کیسے جبکہ اساتذہ کے لئے اُردو پڑھنا غیر ضروری ہی نہیں بلکہ غیر مفید سمجھ لیا گیا ہے۔ کسی بیسک نارمل اسکول یا جونیر ٹریننگ کالج میں اُردو تعلیم نہیں سکھائی جاتی نہ اُردو جاننے والے اساتذہ کا داخلہ ضروری سمجھا جاتا ہے۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے کے اساتذہ جو اُردو جانتے ہیں وہ معتوب ہونے کے ڈر سے اُردو پڑھانا نہیں چاہتے۔ اب اُردو جاننے والے اساتذہ کے لئے ٹریننگ کے دروازے بند ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ دن بدن اُردو داں اساتذہ ناپید ہوتے جاتے ہیں۔ لاکھ اعلانات نکالا کریں لاکھ مراعات دی جاتی رہیں لیکن اگر ان پر عمل نہیں کیا جاتا ہے تو کیا فائدہ؟ عمل کیوں نہیں ہوتا ہے؟ اس کا جواب صاحبانِ اقتدار ہی دے سکتے ہیں۔ اُردو والے غریب تو جب کبھی وہ حرفِ زبان سے شکایت کرتے ہیں تو وہ مجرم و غدار بنائے جاتے ہیں۔ اور ان پر طرح طرح کے الزامات عائد کئے جاتے ہیں وہ تو یہ بھی کوئی بات نہیں کہ یہ ثابت کیا جاتا کہ اُردو صرف اسی ملک کی زبان ہے وہ اسی دیس میں پیدا ہوئی، اسی دیس کی آب و ہوا میں پروان چڑھی وہ یہاں کے ہندو مسلمانوں سکھوں عیسائیوں سب کی زبان ہے۔ وہ نہ غیر ملکی ہے اور نہ اس کے بولنے والے غیر ملکی اور غدار۔ وہ نہ ہندی کی حریف ہے اور نہ اس پر عرب و ایران کی چھاپ ہے۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے وہ جس طرح ہندستان کے گوشے گوشے میں بولی اور سمجھی جاتی تھی ۱۵ برس گزر جانے اور ہر قسم کی اُردو کشی کے باوجود آج بھی وہ قریب قریب ملک کے ہر گوشے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ پھر یہ کہنا کہ اُردو کوئی زبان ہی نہیں ہے اس زمانہ کی سب سے بڑی ناانصافی ہے اور ہندی سامراجیت کی کھلی ہوئی زیادتی۔ آفتاب کی روشنی سے اگر کوئی انکار کرے تو اس کا کیا علاج ہے۔ اسی طرح اُردو کے وجود سے اگر سامراجی ذہنیت رکھنے والے ہندی داں انکار کر رہے ہیں تو یہ ان کی کور چشمی ہے نہ کہ اُردو کا قصور؟

افسوس اس بات کا ہے کہ حق و انصاف کے مدعی بھی اس مرض میں مبتلا ہیں وہ بھی اُردو کا وجود عملاً ماننے کے لئے تیار نہیں۔ اگر دستور ہند میں اس کو تسلیم کر لیا گیا تو کیا ہوا؟ صوبائی اور مرکزی حکومتوں کے محکمہ جات تو اس کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے۔ یہاں تک کہ رفاہِ عامہ کے کاموں میں بھی اس کا استعمال مہاپاپ سمجھا جاتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ قول و فعل کا تضاد کب تک رہتا ہے۔

اُردو والوں کا مختصر طور پر یہ مطالبہ ہے کہ اُردو کو بھی جینے دیا جائے اس کی تعلیم کا معقول انتظام کیا جائے اُردو میں بھی سائنبورڈ لگانے کی اجازت دی جائے جملہ دفتروں میں اردو استعمال کرنے کی اجازت دی جائے اگر عملاً یہ باتیں نہیں ہو سکیں تو اعلانات بے معنی ہیں۔

(فروغِ اُردو لکھنؤ)

تبصرے

پروفیسر احتشام حسین

اُردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ریڈر دہلی یونیورسٹی
ناشر: آزاد کتاب گھر کلاں محل دہلی سنہ ۱۹۶۱ء
قیمت: ایک روپیہ

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے قدیم نظام تعلیم میں زبان کا مطالعہ کئی حیثیتوں سے اہمیت رکھتا تھا لیکن بہ حیثیت ایک صوتی نظام کے، اس کے سائنٹفک مطالعہ کی جانب توجہ کم کی جاتی تھی۔ قرآن مجید کی قرأت کے سلسلے میں تجوید اور ترتیل کی تعلیم دی جاتی تھی لیکن اس کی بنیاد بھی محدود اور کمزور تھی، اس کا اطلاق دوسری زبانوں کی آوازوں پر مشکل ہی سے ہوتا تھا۔ لیکن جدید لسانیات میں صوتیات اور تشکیل صوتیات نے ساری دنیا کی آوازوں کو سائنٹفک انداز میں تقسیم کر دیا ہے اور ان آوازوں کے باہمی تعلقات، اشتراک اور اختلاف کی توضیح بھی کر دی ہے۔ اس لئے زبانوں کی تعلیم، اور خاص کر مادری زبان کے علاوہ دوسری زبانوں کی تعلیم کے طریقے بالکل بدل گئے ہیں یا بدل رہے ہیں۔ یہ طریق کار تمام ترقی یافتہ ملکوں میں بہت کامیاب ثابت ہوا ہے۔ ہندوستان میں زبانوں کی تعلیم اکثر ان اساتذہ کے ہاتھ میں ہے جنھیں لسانیات اور صوتیات سے کوئی واقفیت نہیں ہوتی، ان کو قواعد زبان پر بھی عبور نہیں ہوتا۔ اس لئے مادری زبان کے سیکھنے میں بھی بچوں کو دشواریاں پیش آتی ہیں چہ جائیکہ وہ دوسری زبانیں سیکھیں۔

ان باتوں کو پیش نظر رکھ کر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے یہ مختصر سی کتاب پیش کی ہے اور واقفکارانہ انداز میں پیش کی ہے۔ ایک مختصر سی تمہید کے بعد صوتیات اور صوتی تجزیے کے اصول صاف اور سادہ زبان میں بیان کئے گئے ہیں، آوازوں کے فرق اور مشق کے ذریعہ ان کے صحیح مخارج کی وضاحت کی گئی ہے، زبان کی تعلیم میں قواعد کا جو مقام ہے اس کی تفصیل دی گئی ہے اور اسی نقطۂ نظر سے زبان کی تعلیم دینے والے کے لئے ضروری اشارے اور ہدایات پیش کی گئی ہیں۔ اگرچہ بنیادی طور پر مصنف کے سامنے اُردو ہی زبان تھی لیکن اصولی بحثوں میں لسانیاتی تعلیم کے بہت سے پہلو واضح ہو گئے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ڈاکٹر نارنگ کی یہ کوشش علمی حلقوں میں عزت کی نظر سے دیکھی جائے گی اور اس وقت جب کہ لسانیات کا علم کسی قدر ہر دلعزیزی حاصل کر رہا ہے یہ کتاب ایک بہت ہی اہم پہلو کی جانب متوجہ کرنے میں کامیاب ہوگی۔ کتاب کسی قدر اور تفصیلی ہوتی تو شاید اس کی افادیت اور زیادہ ہوتی۔

وحید اختر

اجالے

احمد عظیم آبادی
قیمت: تین روپے
ناشر: آزاد کتاب گھر، جمشید پور

احمد عظیم آبادی ایک کہنہ مشق اور بالغ نظر شاعر ہیں ان کا ایک اور مجموعہ "ساز نیز" بھی شائع ہو چکا ہے۔ "اجالے" ان کا دوسرا مجموعہ ہے جس کا دوسرا ایڈیشن ہمارے پیش نظر ہے۔ کتابت اور طباعت صاف ستھری ہے اور سرورق سادہ و پرکار۔

تمام کلام تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ "زاویے" کے عنوان سے نظمیں دی گئی ہیں جن میں نئے موضوعات کے ساتھ نیا انداز بیان ہے۔ عام طور پر جو مجموعے شائع ہوتے ہیں ان کی نظمیں پڑھ کر ہمیں یہ گمان ہوتا ہے کہ ہم آج سے پچاس سال پہلے کی نظم پڑھ رہے ہیں لیکن احمد عظیم آبادی کی نظمیں ہمیں مایوس نہیں کرتیں۔ انھوں نے جدید نظم کی تکنیک، اسلوب اور ہیئت کو بہت کامیابی کے ساتھ برتا ہے۔ "دائرے" کے عنوان سے غزلیں جمع کر دی گئی ہیں۔ ان غزلوں میں بھی رمزیت اور اشاریت کے ساتھ وہ علائم و رموز برتے گئے ہیں جو جدید غزل کی دین ہیں۔ مختصر سے تبصرے میں اشعار کے انتخاب کی گنجائش نہیں ورنہ ایسے شعر بہت مل جائیں گے جو دامن دل و نظر کھینچتے ہیں۔ رباعیات کے حصے کا عنوان "نقطے" ہے۔ یہ حصہ بھی فن اور زبان پر شاعر کی قدرت کا ثبوت ہے۔ "اجالے" آج کے شاعر کے مزاج سے ہم آہنگ بھی ہے اور اپنے عہد کی آواز بھی۔

پبلشر پرنٹر ضمیرالدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن سے شائع کیا